پروفیسر سید عابد علی عابد
مترجمہ سید سجاد رضوی

حافظ شیرازی

(۲)

ہمارے خیال میں جس بات نے زندگی کے متعلق حافظ کے رویے کو متاثر کیا، وہ ان کی ابو اسحاق کے ساتھ وابستگی، عقیدت اور شیفتگی تھی، جس نے ابو سعید کی موت کے بعد جب اس کی سلطنت کے حصے بخرے ہو رہے تھے، فارس پر قبضہ کر لیا تھا۔

ابو اسحاق کہ حافظ کا اوّلین مربّی تھا ۷۴۳ھ سے ۷۵۴ھ تک فارس میں برسر اقتدار رہا۔ ۷۴۳ھ میں حافظ کی عمر ستّرہ برس کی تھی۔ قدرتی طور پر ان میں جوانی کا جوش بھی تھا اور اثر پذیر ہونے کی قابلیت بھی۔ یہ کہنا کچھ مشکل بات ہے کہ حافظ ابو اسحاق کے منظورِ نظر کب ہوئے۔ لیکن اتنی بات ظاہر ہے کہ یہ واقعہ ۷۴۳ھ کے بعد کا ہے اور بہ ظنِ غالب ۷۴۸ھ کے لگ بھگ کا جب حافظ کی عمر بائیس سال کی تھی۔ تقریباً تمام مؤرخین اور نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ حافظ اور ابو اسحاق میں بڑی دوستی تھی۔ یہ بات حافظ کے حق میں کچھ مفید ثابت نہ ہوئی، کیونکہ اس دوستی کی بناء پر حافظ اپنے مربّی کے نقائص کو نہ دیکھ پائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ابو اسحاق کی شخصیت اور کردار سے بے حد متاثر ہوئے۔ ابو اسحاق ایک غیر ذمہ دار، بے پروا، بے اعتدال اور "خوش باش دمی کہ زندگانی این است" کا قائل شخص تھا۔ اس نے مبارز الدین کے ہاتھوں فارس میں محض اس بنا پر شکست کھائی کہ وہ اپنی سلطنت کے لئے لڑنا کوئی اہم بات نہ سمجھتا تھا۔ اور ان تمام تعیشات میں مبتلا تھا جو ہم اس قسم کے حکمران سے وابستہ کر سکتے ہیں۔ جب اسے اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی کہ اس کے سب سے بڑے دشمن مبارز الدین نے شیراز کا محاصرہ کر لیا ہے تو اس نے کہا کہ مبارز الدین بڑا بے وقوف ہے کہ اس بہار کے موسم میں بھی جنگ آزمائی میں مصروف ہے۔ ان تمام نقائص کے باوصف وہ بڑا شائستہ امیر تھا۔ اور شعراء اور اہلِ فن کی بڑی قدردانی کیا کرتا۔ خواجہ کرمانی اور عبید زاکانی بھی اس کی فیاضیوں سے بہرہ یاب ہوئے اور اسی کے دربار میں حافظ سے ان کی شناسائی ہوئی۔

اس کے دربار میں حافظ نے اپنی زندگی کے بہترین دن گذارے۔ اور اگرچہ اس جذبے کی فراوانی کو ناپا تو نہیں جا سکتا جو ان کے اشعار میں ڈھل گیا ہے لیکن یہ بات بغیر کسی خوف کے کہی جا سکتی ہے کہ حافظ کی اس غزل میں جس میں ابو اسحاق کی موت کا ذکر ہے، ایک کلاسیکی رکھ رکھاؤ اور غم کا دبا دبا جذبہ موجود ہے جو دوسری چیزوں سے کہیں زیادہ مؤثر ہے۔ اس میں سے چند شعر یہاں پیش کئے جاتے ہیں:

یاد یاد آں کہ سر کوئے تو ام منزل بود — دیدہ را روشنی از خاک درت حاصل بود
در دلم بود کہ بے دوست نہ باشم ہرگز — چہ تواں کرد کہ سعئ من و دل باطل بود
آہ ازیں جور و تطاول کہ دریں دام گہ است — آہ ازاں لطف و تنعم کہ دراں محفل بود
راستی خاتم فیروزۂ بو اسحاقی — خوش درخشید و لی دولت مستعجل بود

دیدی آں قہقہۂ کبک خراماں حافظ
کہ ز سر پنجۂ شاہین قضا غافل بود[1]

اگر ہم ان اشعار کا بغور مطالعہ کریں اور یہ قرار دیں کہ ان کا سن تالیف ۷۵۸ھ کے قریب ہے۔ تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ابو اسحاق کی قربت اور اس کی موت کے بعد ایران کی عمرانی اور اخلاقی پراگندگی نے حافظ کے دل و دماغ پر یوں اثر کیا کہ انکی طبیعت کا میلان تقدیر پرستی کی طرف ہوگیا اور ان کو یقین ہوگیا کہ انسانی مساعی بے ثمر ہیں اور عیش و طرب کی سب محفلیں ہنی جاتی ہیں۔ اس چیز نے اس عقیدے کو جنم دیا کہ موجودہ لمحہ ہی زندگی میں سب سے اہم شے ہے اور عقل کا تقاضا یہی ہے کہ ثمرِ حیات سے جس قدر رس نچوڑا جا سکے نچوڑ لیا جائے۔ اس زمانے میں دنیا برائی، نکبت اور بدبختی سے پُر تھی۔ اور اہلِ دانش اسی میں خوش ہو جاتے اور اپنے آپ کو بڑا خوش نصیب سمجھتے اگر انہیں گوشۂ عافیت میں چند کتابیں، ایک جامِ شراب اور ایک محبوبۂ دلنواز میسر ہو جاتی۔ اگر یہ مثالی دنیا حاصل ہو جائے تو پھر ان لوگوں کے لئے یہ بات بالکل بے معنی ہوتی کہ ان کے اردگرد کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔

ہم ابھی ابھی ذکر کر چکے ہیں کہ عبید زاکانی بھی ابو اسحاق کے متوسلین میں تھا اور حافظ ۷۵۸ھ سے قبل ہی اس سے آشنا ہو چکا تھا۔[2] عبید زاکانی قزوین کا رہنے والا تھا۔ لیکن اس بات میں شبہ نہیں کہ اس نے شیراز میں تعلیم حاصل کی، اور بالآخر بادشاہ کا منظور ہوگیا۔ جسے اس کی ہجویات اور لطیفے بہت پسند آئے۔ یہ شخص نثر نگار بھی تھا اور شاعر بھی۔ اسکی نثر اپنے زمانے کے عمرانی حالات پر طنز سے مملو ہے۔ ریاکاروں پر اس کی زد بہت زیادہ پڑتی ہے۔ بالخصوص ان لوگوں پر جو علمائے دین کا روپ دھار لیتے ہیں لیکن دراصل بڑی عیاشی کی زندگی گذارتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب اخلاق الاشراف میں اپنے معاشرے کے کسی طبقے کو نہیں بخشتا۔ یہ کتاب اس بنا پر اپنی مثال آپ ہے کہ عبید سنجیدگی سے محو کلام ہو یا انداز تفنن، اس کا اندازِ نگارش، ہمیشہ لطیف اور بے عیب ہوتا ہے۔ اور وہ بڑی خوبی اور کامیابی سے اس اسلوبِ تحریر کی نقل کرتا ہے جو اخلاقی کتابوں کے مصنفوں نے اختیار کیا ہے۔

---

[1] دیوان حافظ صفحہ ۱۴۱۔ (مرتبہ ح۔ پژمان۔ چاپ خانۂ شرکت تضامنی علمی ۱۳۱۸ھ)
[2] تاریخ ادبیات فارسی از براؤن (انگریزی جلد سوم) اور تاریخ مفصل ایران از عباس اقبال (فارسی) صفحہ ۴۲۲

حافظ کو اپنی شاعری کی بناء پر بعض اوقات بڑی کٹھن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ علمائے دین اس کے کلام کے مطالب پر معترض تھے۔ حافظ عبید زاکانی کو ریاکاری کے خلاف نبرد آزما دیکھ چکا تھا اور اس کے تعلقات اس سے بڑے گہرے تھے۔ اس لئے وہ صرف اس قابل ہی نہ تھا کہ علمائے دین کے ان حملوں کا جواب دے سکتا بلکہ وہ یہ قدرت بھی رکھتا تھا کہ ان نام نہاد صوفیوں اور علمائے ظاہر کے خلاف علم جہاد بلند کرتا۔ صفحات آئندہ میں اس بات کا ذکر ہوگا کہ عماد فقیہ کرمانی اور حافظ کے مابین اختلافات کیا رنگ لائے اور انہوں نے کتنی پیچیدگیاں پیدا کیں۔ بہرحال حافظ کو اس معرکہ میں کامیابی نصیب ہوئی اور گمان غالب یہ ہے کہ اس کے بعد حافظ نے زندگی کے ہر شعبے میں ریاکاری اور تلبیس کے پردے بے باکانہ چاک کرنے شروع کر دئے

وہ غزل جس کا مطلع مندرج ہے، غالباً عماد فقیہ کے خلاف فتح یابی کے بعد ہی کہی گئی:

واعظاں کیں جلوہ در محراب و منبر می کنند
چوں بہ خلوت می روند آں کار دیگر می کنند

حافظ خود اس بات کے قائل ہیں کہ انہوں نے طرز شعر میں خواجو کرمانی کا تتبع کیا گیا ہے:

استادِ سخن سعدی ست پیش ہمہ کس اما
دارد سخن حافظ طرزِ سخن خواجو

خواجو کہ آٹھویں صدی ہجری کا ممتاز شاعر تھا، فارسی شعر کے عراقی دبستان کا علمبردار تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے نزدیک مطالب کے مقابلے میں ہیئت زیادہ اہم تھی۔ اس کا اسلوب بڑا مرصع ہے اور وہ تشبیہات و استعارات اور صنائع بدائع بڑے فنکارانہ طریقہ سے استعمال کرتا ہے۔ لیکن اس کے ہاں خلوص جذبات کا فقدان ہے۔ اس کے اشعار میں بڑی تابناکی اور نوک پلک کی درستی نظر آتی ہے جس سے اس بات کا سراغ تو ملتا ہے کہ ان پر بڑی محنت کی گئی ہے لیکن جوش اور ولولہ کہیں نہیں ملتا۔ اس کی زبان بڑی پاکیزہ، اس کا اسلوب مرصع اور اوزان کا استعمال ہر عیب سے مبرّا ہے۔ لیکن بس یہی کچھ اس کی بساط ہے۔ شاعری الفاظ و محاورات کی تابناکی اور آب و تاب کے ماوراء ہوتی ہے۔ اور اس بات سے ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ محولہ بالا شعر حافظ نے اس زمانے میں کہا ہوگا جب وہ ابھی نوجوانی اور ناپختگی کے دور میں تھے۔ بہرحال حافظ اور خواجو کے اسلوب میں صرف سطحی سی مشابہت ہے اور اس کا کچھ مطلب نہیں۔ خواجو مسلمہ طور پر دوم درجہ کا شاعر ہے اور حافظ اقلیم غزل کا بادشاہ۔

لہٰذا حافظ نے خواجو سے جو اکتساب فیض کیا وہ صرف اسی حد تک ہے کہ انہوں نے خواجو کے کلام کے مطالعہ سے یہ بات سیکھی کہ اظہار مطالب کے لئے ایک صاف ستھرے مرصع اسلوب کا انتخاب کیا اور تشبیہات

واستعارات کو پوری فنی مہارت سے استعمال کیا۔ نقادوں نے اس بات کے اثبات میں بڑی کاوش سے کام لیا ہے کہ حافظ اور خواجو کے کلام میں بہت سے مشترک موضوعات ملتے ہیں۔ ان میں انسانی مساعی کی بے حاصلی، تقدیر کا اٹل ہونا اور عیش و مسرت کے لمحات اور ہر حسین شے کا زوال پذیر ہونا شامل ہیں۔ اگر یہ بات مان بھی لی جائے تو بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر حافظ اور خواجو ہی میں یہ مشابہت کیوں تلاش کی جائے۔ یہ موضوعات تو ہر اعلےٰ پایہ کے ایرانی شاعر کے یہاں دستیاب ہوتے ہیں بلکہ اس معاملے میں تمام مشرقی شعراء ایک ہی کشتی میں سوار نظر آتے ہیں۔ اور پھر حافظ اور خواجو میں بین فرق بھی تو موجود ہے۔ حافظ کے ہاں یہ کمال ملتا ہے کہ وہ بالکل معمولی اور فرسودہ، بے کیف و بے رنگ موضوعات کو جامۂ شعر عطا کرتا ہے۔ وہ شیکسپیئر کی طرح خاک کو اکسیر بنا ڈالتا ہے۔ اس کے برخلاف خواجو محض لفظی صنعت گری کا دلدادہ اور روایات کا غلام تھا۔ یہ بات اس کے حیطۂ قدرت میں نہ تھی کہ وہ کسی انوکھے زاویے سے حقیقت کا ادراک کر پائے۔

اس بحث کے خاتمہ سے قبل یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ یہاں حافظ کے اس قطعہ کا ذکر کیا جائے، جس میں حافظ آلِ ابواسحاق کے زمانہ کی مشہور شخصیتوں کا ذکر کیا ہے:

به عهدِ سلطنتِ شاه شیخ ابواسحاق — به پنج شخص عجب ملک فارس بود آباد
نخست بادشهی همچو او ولایت بخش — که جان خلق به پرورد و داد عیش بداد
دگر بقیهٔ ابدال شیخ امین الدین — که یمن همت او کارهائی بسته کشاد
دگر شهنشهِ دانش عضد که در تصنیف — بنائی کارِ موافق بنامِ شاه نهاد
دگر کریم چو حاجی قوام دریا دل — که نام نیک ببرد از جهان به دانش و داد
دگر مربی اسلام مجد دولت و دین — که قاضی به ازو آسمان ندارد یاد
نظیر خویش نبگذاشتند و بگذشتند — خدائے عزوجل جمله را بیامرزاد

ان اشعار میں جن اشخاص کا ذکر ہے ان کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

(ا) شاہ اسحاق اینجو: اس کا ذکر ہو چکا ہے اور خاندان مظفریہ کی بحث میں مزید تفصیلات پیش کی جائیں گی۔

(ب) امین الدین[1] کہ بجا طور پر ابواسحٰق کا درباری تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اہل تصوف میں بھی شامل

---

[1] تاریخ ادبیاتِ ایران۔ رضازادہ شفق صفحہ ۳۰۸۔ ادبیاتِ ایران یہ عہد مغولان از براؤن مترجمہ داؤد رہبر صفحہ ۳۰۸ تاریخ مفصل ایران۔ عباس اقبال جلد اوّل صفحہ ۴۲۲۔

تھا، اور ابدال کا مرتبہ حاصل کر چکا تھا۔ اس کے مزید حالات نہیں ملتے۔ صرف یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ عبید زاکانی کا دوست تھا۔

(ج) قاضی عضدالدین عبدالرحمٰن ایجی (متوفی ۷۵۶ھ) بڑے پائے کا عالم تھا اور علم کلام میں کمال رکھتا تھا۔ یہ مشہور و معروف کتاب 'مواقف' کا مصنف تھا جو اس نے رشیدالدین کے (کہ ایلخانیوں کا نامور وزیر تھا) بیٹے غیاث الدین کے نام معنون کی تھی۔ یہ غیاث الدین ۷۳۶ھ میں مارا گیا۔ جب ۷۵۴ھ میں شاہ مبارزالدین نے شیراز کا محاصرہ کیا تو ابواسحاق نے ایجی کو شاہ شجاع سے گفت و شنید کے لئے بھیجا جو اپنے والد کی طرف سے فوجوں کی کمان کر رہا تھا۔ یہ گفت و شنید ناکام ہوئی۔ شاہ شجاع بڑے احترام سے پیش آیا لیکن اپنے موقف پر جما رہا اور قاضی عضدالدین ناکام واپس ہوا۔ واپسی پر شاہ شجاع نے اس کے علم و فضل کے احترام کی بنا پر اسے بیس ہزار دینار عطا کئے۔ یہ ایجی کی خوش قسمتی تھی کہ یہ ابوسعید، ابواسحاق اور شاہ شجاع تینوں کا منظور نظر رہا اور مرتے دم تک اس کی عزت اور احترام برقرار رہے۔[1]

(د) حاجی قوام[2] کہ شاہ ابواسحاق کے دور میں بڑے ذمہ دار عہدہ پر فائز تھا اور شعبۂ مالیات سے متعلق تھا حافظ پر بہت مہربان تھا۔ وہ نہایت اعلیٰ پایہ کا منتظم تھا اور ۷۵۸ھ میں راہیٔ ملک بقا ہوا۔ اس کی موت ابواسحاق کے لئے فال بد تھی جو اس قابلیت اور پایہ کے منتظم اہلکار سے محروم ہو گیا۔ خود حافظ نے حاجی قوام کی تاریخ وفات ایک قطعہ میں کہی ہے جس کا عنوان "تاریخ فوت حاجی قوام الدین حسن" ہے۔[3]

یہاں اس کے نام کا قوام الدین محمد صاحب عیار[4] سے تسامح نہیں ہونا چاہئے جس کی تاریخ وفات حافظ ہی کے ایک قطعہ سے ۷۴۶ھ ہجری ظاہر ہوتی ہے۔

(ھ) چھٹے شعر میں مجد کا کلمہ ذو معنی استعمال ہوا ہے اور اس سے قاضی مجدالدین اسمٰعیل[5] مراد ہے جو شیراز کا قاضی اور مدرسہ مجدیہ کا بانی تھا۔ حافظ کے ایک قطعہ سے اس کی تاریخ وفات ۷۵۲ھ ہجری ظاہر ہوتی ہے۔

ابن بطوطہ بیان کرتا ہے کہ سلطان محمد اولجایتو خدابندہ ایلخان نے ایک بار حکم دیا کہ قاضی مجدالدین کو وحشی کتوں کے آگے ڈال دیا جائے جن کو اس بات کی تربیت دی گئی تھی کہ وہ اس قسم کے بدنصیب کو پھاڑ کھائیں لیکن کتوں نے قاضی مجدالدین کو گزند پہنچانے سے منہ موڑ لیا۔ اور اس واقعہ سے اولجایتو بہت متاثر ہوا، قاضی کے پاؤں چومے اور طلبگار عفو ہوا۔

---

[1] دیکھئے حوالہ بر صفحہ ۱۲ صفحات ۳۵۰ تا ۳۵۲ - ۴۱۹ - ۴۳۶ - ۵۱۰ - ۵۱۱ - ۵۲۶۔ [2] حوالہ مذکور صفحہ ۴۲۳۔
[3] دیوان حافظ مرتبہ ح۔ پژمان صفحہ ۳۵۵ [4] ایضاً صفحہ ۳۵۴۔ [5] ایضاً صفحہ ۳۵۵۔

(د) انسان اور فنکار کی حیثیت سے حافظ کے کردار پر ان واقعات نے بھی بڑا گہرا اثر ڈالا جو ابو اسحاق کی سلطنت کا تختہ اُلٹ جانے سے ظہور پذیر ہوئے۔ اور اس لحاظ سے متقاضی ہیں کہ ان کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔

امیر مبارز الدین محمد کہ خاندانِ مظفریہ کی حکومت کا بانی تھا، غیاث الدین حاجی کی اولاد میں سے تھا جو منگولوں کے حملے کے دوران میں خراسان سے یزد چلا آیا تھا مبارز الدین نے اپنی صلاحیت اور قابلیت کا اظہار کیا اور سلطان ابو سعید کی ملازمت میں آگیا جس نے ۷۱۷ھ کے قریب اسے ایک اہم مہم پر روانہ کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ سید عضد الدین یزدی کو قرار واقعی تنبیہ کی جائے جس نے ایلخانیوں کے خلاف سرکشی کی تھی۔ مبارز الدین نے باغیوں کو سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیا۔

اس کے بعد ایلخان کی نگاہوں میں مبارز الدین کی قدر و منزلت بڑھ گئی۔ ۷۲۹ھ میں اس نے کرمان کے حاکم شاہ جہاں کی بیٹی سے شادی کر لی۔ جس کے بطن سے دو نامور بیٹے یعنی شاہ شجاع اور شاہ محمود پیدا ہوئے۔ حصول قوت کی کوشش میں مبارز الدین نے ۷۳۶ھ کے بعد کرمان پر قبضہ کر لیا جس پر شادی کی بناء پر اس کا قانونی حق بھی تھا۔

مبارز الدین بڑا اولوالعزم حکمراں تھا اور بڑا سخت کوش۔ اپنی طاقت کو مجتمع کرنے کے لئے شب و روز محنت کیا کرتا۔ ۷۴۳ھ میں ابو اسحاق نے فارس پر قبضہ کر لیا لیکن آہستہ آہستہ اس کی طاقت میں کمی آتی گئی جس کی وجہ عیاشی اور شراب خوری تھی۔ بڑی عجیب بات ہے کہ وہ مبارز الدین سے کرمان ہتھیانے کا خواب دیکھتا اور اس پر گاہے گاہے حملہ آور ہوتا۔ مبارز الدین کہ حالات سے آگاہ تھا صورت حالات کا جائزہ لیکر اور چند معمولی جھڑپوں کے بعد شیراز کا محاصرہ کر لیا۔ یہ ۷۵۴ھ کا واقعہ ہے اور اس مہم کی ذمہ داری اس نے اپنے بیٹے شاہ شجاع کو سونپی تھی۔ اسی سال وہ شیراز میں وہاں کے باشندوں کی مدد سے داخل ہو گیا جو ابو اسحاق کے رویہ سے بیزار تھے کہ اس حالت میں بھی وہ دادِ عیش دے رہا تھا جب دشمن شہر کے دروازوں پر موجود تھا۔

ابو اسحاق شیراز سے بھاگ کھڑا ہوا اور کوشش کرتا رہا کہ اپنی فوجوں کو از سرِ نو منظم کرے لیکن وہ ناکام رہا۔ آخر کار ۷۵۷ھ میں وہ قید ہوا اور جمعہ ۲۱ جمادی الاوّل ۷۵۸ھ کو قتل کر دیا گیا۔ جیسا کہ ہم ابتدا ہی میں اشارہ کر چکے ہیں امیر مبارز الدین بڑا سخت کوش آدمی تھا اور یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ اس کے بیٹے شجاع اور محمود عیش و عشرت کے دلدادہ ہوں۔ لیکن دونوں شہزادے بہ تقاضائے شباب عیش و مسرت کے ہر ہر لمحے سے لطف اندوز ہوتے۔ اس بنا پر باپ بیٹوں میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔ کیونکہ مبارز الدین احکامِ شریعت کا بڑا سخت پابند تھا۔ اُس نے اپنے بیٹوں کو سرزنش کی اور کہا کہ وہ اپنے عادات و اطوار بدلیں ورنہ اس کا نتیجہ بڑا خراب ہو گا۔ دونوں بھائیوں نے اپنے بچاؤ کی خاطر باپ کو گرفتار کرنے کی سازش کی جو کامیاب ہو گئی اور مبارز الدین ۷۵۹ھ میں گرفتار ہو گیا۔

اور بعد ازاں شاہ شجاع کے اشارے پر اس کی آنکھوں پر سلائی پھیر دی گئی۔

حافظ نے اس موقع پر ایک قطعہ لکھا جس کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں:

دل منہ بر دنیا و اسباب او — زاں کہ از وی کس وفاداری ندید
گر بہ ایامی چراغے بر فروخت — چوں تمام افروخت بارش در دمید
شاہ غازی خسرو گیتی پناہ — آنکہ از شمشیر او خوں می چکید
آنکہ روشن بد جہاں بینش بدو — میل در چشم جہاں بینش کشید

یہ دل شکستہ بادشاہ ۶ سال تک قید رہا اور آخر ۷۶۵ھ میں موت کو اس پر رحم آیا اور اسے قید و بند کی مشکلات سے رہائی نصیب ہوئی۔ مبارز الدین احکام مذہب پر بڑی سختی سے عمل کرتا تھا اور سارے ملک میں قانون شریعت نافذ کر رکھا تھا۔ اس نے اپنی سلطنت میں ہر قسم کی شراب کی خرید و فروخت اور اس کا استعمال ممنوع قرار دے دیا تھا۔ اور اسی بناء پر شیراز کے ظریفوں نے اُسے شاہ محتسب یا محتسب کا نام دے رکھا تھا۔

حافظ کے اشعار کا تاریخی تسلسل ان چند صورتوں کے ماسوا معین کرنا ممکن نہیں جہاں بعض تلمیحات یا اشارات اشعار کے زمانہ تصنیف کا سراغ دیتے ہیں۔ لیکن یہ بات شک و شبہ سے خالی ہے کہ فارس پر مبارز الدین کے قبضہ اور شراب پر پابندی کے بعد کلمہ محتسب حافظ کی شاعری میں علامتی اہمیت کا حامل ہو گیا تھا۔ جب کبھی وہ محتسب کا ذکر کرتا تو اس سے اس کی مراد مبارز الدین ہی ہوتی۔ عباس اقبال نے صرف دو مثالیں دی ہیں لیکن درحقیقت اس کی تعداد بہت زیادہ ہے[1]۔ یہاں چند ایک پیش کی جاتی ہیں:

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز است — بیانگ چنگ مخور می کہ محتسب تیز است
من نہ آں رندم کہ ترک شاہد و ساغر کنم — محتسب داند کہ من ایں کارہا کم تر کنم

اس قسم کے اور بہت سے اشعار ہیں مگر ان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں محتسب عام معانی میں استعمال ہوا ہے اور کوئی دلیل نہیں جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ اس سے شاہ مبارز الدین مراد ہے لیکن ایک شعر ایسا ہے جو سارا معاملہ طے کر دیتا ہے اور وہاں محتسب سے مراد بادشاہ ہی ہو سکتا ہے ورنہ شعر بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور وہ شعر یہ ہے:

محتسب داند کہ حافظ فاسق است — وآصف سر ملک[2] سلیمان نیز ہم

---

[1] تاریخ مفصل ایران۔ عباس اقبال۔ صفحہ ۴۳۵۔ [2] یہاں آصف سے مراد وزیر اعظم ہے، آصف برخیا، ادبی روایت میں حضرت سلیمان کے وزیر کا نام ہے۔ سلیمان بھی ان روایات کے مطابق ایرانی تھے اور انہیں جمشید اور سکندر بھی کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ملک سلیمان سے ایران مراد ہونا ظاہر ہے۔ دیکھئے غیاث اللغات (کلمہ جمشید)

اب اس شعر میں اگر ہم یہ فرض کریں کہ محتسب کے عام معانی مراد ہیں تو پھر اسی شعر میں وزیرِ اعظم کا نام لینا بے معنی ہو جاتا ہے۔ ان دونوں عہدہ داروں میں کوئی تعلق نہیں اور نہ ایک دوسرے کے مدِّ مقابل ہیں۔ البتہ اگر ہم محتسب سے مبارز الدین شاہ فارس مراد لیں تو محتسب کا کلمہ ایک نئی اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے اور ایک ہی شعر میں بادشاہ اور وزیر کا ذکر معنی خیز بھی ہو جاتا ہے۔

بہرحال باپ کو گرفتار کرنے کے بعد شاہ شجاع نے بڑی طاقت حاصل کر لی اور اپنے بھائی محمود کو سر اُٹھانے کی مہلت نہ دی۔ اس نے زمامِ حکومت سنبھالتے ہی شراب پر اپنے باپ کی عائد کردہ پابندی اُٹھالی۔ حافظ نے اپنے بہت سے شعروں میں اس تبدیلی کا خیر مقدم کیا ہے۔ شاہ شجاع اگرچہ شاعر نہ تھا لیکن شعر و سخن (اور اس کے لوازمات) کا دلدادہ ضرور تھا۔ حافظ پر خصوصاً کرم فرما تھا۔ جسے اس بات کی بڑی شدید ضرورت تھی کہ کوئی شخص شاہ ابو اسحاق کی وفات کے بعد اس کی دلدہی کرتا جو اس کے نزدیک گویا عظمت و شکوہ کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔

کچھ عرصے تک شاہ شجاع حافظ اور اس کی غزل گوئی کا دلدادہ و شیدا رہا۔ لیکن اپنے بھائی محمود سے متواتر پرخاش اور بعض دوسری ناکامیوں کی بنا پر اس کی زندگی تلخ ہو گئی اور اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کی تمام تر مشکلات کا باعث اس کے گناہ ہیں۔ اسی زمانے میں اس کی ملاقات عماد فقیہ کرمانی (متوفی ۷۳۳ ہجری) سے ہوئی جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی بلّی کو نماز پڑھنا سکھا رکھا تھا۔[1] اس شعر میں حافظ نے اسی عیاری کی جانب اشارہ کیا ہے:

ای کبک خوش خرام کجا میروی بایست
غرّہ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد

اسی طرح یہ بھی مشہور ہے کہ عبید زاکانی نے اپنی مثنوی موش و گربہ میں عماد کی اسی مکاری کا ذکر کیا ہے۔ یہ قصہ قرینِ قیاس ہے اور ایک فریب کار عالمِ دین کو بادشاہ کا منظورِ نظر بننے کے لئے ہر اس طریقے کو اختیار کرنے میں کوئی باک نہ ہوگا جس سے اس کا اُلّو سیدھا ہوتا ہو۔ ہمیں اس بات پر بھی غور کرنا پڑتا ہے کہ اگر ہم یہ تسلیم نہ کریں کہ عماد کی بلّی عبید زاکانی کی مثنوی کی محرک تھی تو وہ بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے اور اس کی طنز پھیکی لگتی ہے۔

بہرحال شاہ شجاع عماد کے زیرِ اثر آگیا اور اپنے باپ سے بھی زیادہ کٹر دیندار بن گیا۔ حافظ قدرتی طور پر اس کی نظروں سے گر گئے۔ عماد کا حافظ کو مشکلات میں پھنسانے کی کوشش کرنا مشہور و معروف بات ہے جس کی

---

[1] ادبیاتِ ایران بعہدِ مغولاں صفحہ ۴۰۲-۴۰۳۔

تکرار غیر ضروری ہے لیکن زین الدین ابوبکر تائی آبادی کی طبع رسا کو داد دینا چاہیئے کہ حافظ ایک قانونی موشگافی کی بنا پر بچ نکلے[۱]۔ شاہ شجاع نے ۷۸۶ھ میں انتقال کیا۔

اب کہ حافظ کی زندگی کے اہم واقعات سے بحث ہو چکی ہے اور تمام سوانحی مواد یکجا ہو چکا ہے یہ بات مفید ہوگی کہ ان واقعات کا جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ بحیثیت انسان اس کے خدوخال کیسے ہیں اور ایک ایسے فنکار کی حیثیت سے اس کا کیا مقام ہے جو ان واقعات کے خم و پیچ سے ہو گذرا ہے۔ ہمیں یہ بات ماننے پر مائل ہونا پڑتا ہے کہ حافظ ۷۶۰ھ کے قریب ذہنی پختگی حاصل کر چکے تھے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ انکے عقائد و آراء اور فن کے بارے میں ان کے تصورات اس وقت اپنی اصلی صورت اختیار کر چکے تھے جب انکی عمر ۴۴ سال کے قریب تھی۔

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ حافظ نے بچپنے میں ایلخانیوں کی عظیم الشان سلطنت کو خاک میں ملتے ہوئے دیکھا تھا۔ انھوں نے اپنے ملک کے مکمل سماجی اور اخلاقی انتشار کا مشاہدہ کیا تھا۔ بد اطوار اور نا اہل وزراء، ناکارہ اہلکاروں، کھوکھلی اشرافیت، بے حال متوسط طبقے، مکار اور عیار مذہبی رہنماؤں[۲]، بے راہ اور دکھاوے کے صوفیوں، حصول اقتدار کی ناگفتہ بہ کوششوں اور اسی قسم کے دوسرے واقعات کے متعلق انھوں نے بہت کچھ سنا بھی تھا اور بعض سوانح اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ ان باتوں کا ان کی حساس طبیعت پر بڑی جلدی اثر ہوا۔ لیکن اُنھوں نے زندگی کے حقائق کا مقابلہ اور اپنے مشاہدات کو قالب شعر میں ڈھال کر معاشرتی حالات کی ایسی عکاسی کرنے کی بجائے کہ اس میں اصلاح کا جذبہ کارفرما ہو، اپنے آپ کو اپنے ہی اندر سمیٹ لیا۔ تمام معروضی صداقتیں ان کے نزدیک گویا بیم و ہراس کی تصویریں بن گئیں۔ وہ زندگی بھر اپنے ہی احساسات و جذبات کی عکاسی کرتے رہے۔ مختصر یہ کہ وہ اپنی موضوعی دنیا کی تصاویر بڑے حسین پیرایہ میں پیش کرتے رہے۔ خیام کی مانند اُنھوں نے ماضی کو مُردہ گردان کر ترک کر دیا اور مستقبل کی طرف اس لئے نگاہ نہ ڈالی کہ غیر یقینی ہے۔ ان کی زندگی صرف حال تک محدود رہی جس میں ان کا کام یہ تھا کہ وہ شرب و نوش کی محفلوں اور خوبان دلآرا کی مجلسوں کے جویا رہے تاکہ وہ اس ماحول سے فرار حاصل کر سکیں جس کا وہ لازمی جزو تھے اور جسے خوبصورت الفاظ اور صنائع بدائع کے طلسم میں گم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جب شاعر کو ایسے اہم معاملات درپیش ہوں جو اپنی عکاسی اور اپنے علاج کا تقاضا کرتے ہوں تو محبت ایسا قوی ترین جذبہ بھی ثانوی اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔

---

[۱] ادبیات ایران بعہد مغولاں صفحہ ۴۰۲-۴۰۳

[۲] حافظ نے مذہبی ریاکاری کے خلاف آواز ضرور بلند کی لیکن یہ اس کے تخلیقی کارناموں کا صرف اتفاقی حصہ ہے۔

بعض جگہ حافظ کے ہاں بھی محبت بہت ادنیٰ قسم کے جذبہ کی صورت نظر آتی ہے جو فرار زیادہ ہے اور ایک گہرا لگاؤ اور باہمی اُنس کم۔ مثال کے طور پر یہ شعر لیجئے:

ای دل بہ کوئی عشق گذاری نمی کنی　　اسباب جمع داری و کاری نمی کنی

شہر لیست پر حریفاں واز ہر طرف نگاری　　یاراں صلائے عشق است گرمی کنید کاری

یہ بات عشق و محبت میں سودے بازی جیسا رویہ ہے اور ہمیں یہ گمان گذرتا ہے کہ حافظ کا عشق ان کی اس شعوری کوشش کی تخلیق ہے کہ وہ اپنے سامنے کی زندگی سے فرار حاصل کریں۔

گمان گذرتا ہے کہ یہ جمالیاتی حظ نہیں جو حافظ کو مشاہدۂ حسن (خواہ وہ مجازی ہو یا حقیقی) پر مجبور کرتا ہے بلکہ یہ ذاتی مصائب و آلام سے فرار کی ایک سبیل ہے۔ شراب بھی اسی کام آتی ہے اور عشق و محبت بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ شاعر گرد و پیش کے حالات سے آنکھیں بند کر کے اس میں منہمک ہو سکے۔

اقوامِ مشرق عام طور پر تقدیر کی قائل ہیں اور اس سے فائدے بھی مترتب ہوتے ہیں۔ انسان جب چاہے تقدیر کو کوس لے اور یہ سوچ کر فریب میں مبتلا ہو جائے کہ انسان کی تمام کوششیں بے کار اور بے ثمر ہیں:

در کوئے نیک نامی مارا گذر ندادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

(باقی)

مجلس ترقیٔ ادب ـــــ کا ـــــ سہ ماہی مجلّہ

صحیفہ

مدیر:- سید عابد علی عابد

مشہور و مقبول قلم کاروں کے مضامین

معیاری طباعت • رنگین سرورق • سالانہ دس روپے • فی پرچہ تین روپے

پتہ:- معتمد مجلسِ ترقیٔ ادب۔ باغ ترسنگھ داس۔ کلب روڈ۔ لاہور